تدوینِ فقہ

(۳)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

عہدِ نبوت میں فقہ کی حالت

بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی اور مدنی زندگی کے ابتدائی چند سال تک اس لئے بھی کہ خود صاحبِ وحی مسلمانوں میں موجود تھے نیز اسلام کے حلقۂ اثر میں جو لوگ داخل ہوئے تھے ان کی تعداد بہت محدود تھی بقول جرجی زیدان

تاسست المملكة[1] الاسلامية في	ہجرت کے پہلے سال میں مملکت اسلامیہ کی بنیاد
المدينة في السنة الاولى للهجرة و	مدینہ منورہ میں قائم ہوگئی، اور مسلمان اس وقت
المسلمون قليلون وكل ارض خارج	بہت تھوڑے تھے، زمین کا ہر وہ خطہ جو مدینہ
من اسوار المدينة غير ارضهم و	کی شہر پناہ سے باہر تھا وہ مسلمانوں کی زمین
كل رجل غير الصحابة عدو لهم	نہ تھا، اور صحابہ کے سوا جو بھی تھا وہ ان کا
وحدود تلك المملكة محصورة	دشمن ہی تھا، اس اسلامی مملکت کے حدود صرف
بيثرب وبعض ضواحيها۔	یثرب اور بعض اس کے مضافات تک محدود تھے۔"

ظاہر ہے کہ قدرتی طور پر ایسی صورت میں حوادث و واقعات کی مختلف پیچیدہ شکلیں یوں ہی کم پیش آتی تھیں اور کبھی کبھی جو پیش بھی آجاتی تھیں تو خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ نفسِ نفیس ان میں موجود تھے، باسانی صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتے تھے حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

---

[1] التمدن الاسلامی ص ۹۳ -

درزماں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مردماں درہمہ انواع علوم چشم بر جمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وگوش بر آواز وے می داشتند ہرچہ پیش می آمداز مصالح جہاد وہدنہ وعقد جزیہ واحکام فقہیہ وعلوم زہدیہ ہمہ ازاں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم استفسار نمودند۔ ؎۵

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہرقسم کے علم کے متعلق لوگوں کی نگاہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ مبارک پر جمی ہوئی تھیں ان کے کان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لگے ہوئے تھے جہاد کی مصلحتوں صلح وجزیہ کا معاہدہ فقہی احکام، زہد کے متعلق علوم وغیرہ کے متعلق جو باتیں بھی پیش آتی تھیں سب کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

لیکن اچانک قطعاً ایک معجزانہ شکل میں اسلام کے دائرہ اثر میں وسعت شروع ہوئی اور ٹھیک چڑھتی ہوئی دھوپ کے مانند اقطار ارض کو وہ اپنے احاطہ میں لینے لگا۔ فتوحات کے سواوفود کا تانتا بندھا ہوا تھا، جو جزیرہ عرب کے ۱۰ لاکھ مربع میل والی زمین کے مختلف علاقوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ٹڈیوں کے دل کی طرح اسی شکل میں جیسا کہ قرآن میں ہے۔

یدخلون فی دین اللہِ افواجاً داخل ہوئے جاتے ہیں اللہ کے دین میں فوج فوج

ہر طرف سے کھنچے چلے آرہے تھے اور اسی بنیاد پر عہدِ نبوت ہی میں یہ ضرورت پیش آگئی کہ وحی ونبوت کے ذریعہ سے معلومات کا جو مجموعہ مسلمانوں کے سپرد کیا جارہا ہے اس کے کلیات کو جزئی واقعات پر صحیح طریقہ سے منطبق کرنے اور جدید حوادث ونوازل واقعات وحالات کے لئے ان ہی کی روشنی میں احکام پیدا کرنے کا کوئی نظم کیا جائے کیونکہ عربوں کی حالت جیسا کہ شاہ ولی اللہ ہی نے لکھا ہے، نزول قرآن وبعثت محمدی کے بعد یہ ہوگئی تھی کہ

کہ گویا الیوم از شکم مادر بہ ظہور آمدہ اند کہ گویا آج ہی ماں کے پیٹ سے باہر ہوئے ہیں

؎۵ ازالۃ الخفا رج ۲ ص ۱۴۰۔

چہ علوم رسمیہ تجربیہ کہ پیش از بعثت سید الرسل علیہ وسلم معلوم ایشاں بود۔ ہمہ در سطوت فیوض نازلہ از جانب مدبر السموات والارض جلت قدرتہ متلاشی گشتہ ودر ہر باب غیر از حکم حضرت مخبرِ صادق م وظیفہ ایشاں نہ بود۔ ؎۱

کیونکہ رسمی علوم ہوں یا تجربی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے ان کی متعلق جو کچھ بھی ان کے معلومات تھے سب کے سب ان نازل ہونے والے فیوض جو آسمان وزمین کے مدبر حق تعالیٰ جلت قدرتہ کی طرف سے نازل ہورہے تھے ان کی سطوت کے سامنے سارے معلومات ناپید ہوکر رہ گئے اور ہر بات میں مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے سوا اور کوئی چیز اُن کے سامنے باقی نہیں رہی تھی۔

پھر جیسا کہ میں بار بار کہتا چلا آرہا ہوں کہ حسی معلومات ہوں یا وحی نبوت کی راہ والے معلومات دونوں کے متعلق کچھ نہ کچھ عقل سے کام لینے کی ضرورت تو ہر شخص کو پیش آتی ہے! لیکن ان معلومات کو پیشِ نظر رکھکر باضابطہ کسی فن کا پیدا کرنا یہ ہر شخص کا کام نہیں ہوسکتا۔ اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگوں کے متعلق تاریخوں میں اسلامی نصوص کے سمجھنے کے جو واقعات منقول ہیں، ان ہی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ کام ہر شخص کا نہیں ہوسکتا۔

کہتے ہیں کہ ایک عالم عربی زبان کے جاننے والے صاحب کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ استنجا سے جب فارغ ہوتے ہیں تو باضابطہ وضو کرکے تین رکعتیں وتر کی لزوماً ادا کرتے ہیں آخر کسی۔ نے دریافت کیا کہ یہ نماز جو تم پڑھتے ہو کیا ہے، بڑے غصہ میں آپ نے جواب دیا کہ لوگوں کو حدیث کا علم نہ ہو تو میں کیا کروں، دریافت کیا گیا کہ حدیث کیا ہے، مشہور حدیث

من استجمر — جو استنجا میں ڈھیلا استعمال کرے چاہئے کہ

فلیوتر — طاق عدد استعمال کرے۔

؎۱ ازالۃ الخفا رج ص ۱۴۔

آپ نے پڑھ کر سُنائی، صحاح کی کتابوں سے نکال کر اسے دکھایا، حالانکہ ان کو مغالطہ صرف یہ لگا کہ "فلیوتر" جس کا ترجمہ ہے طاق عدد میں کلوخ آدمی استعمال کرے، آپ نے اسی فلیوتر کا ترجمہ یہ سمجھ لیا کہ وتر کی نماز پڑھے۔

اسی قسم کا لطیفہ مشہور ہے کہ ایک صاحب جمعہ کی نماز سے پہلے سر منڈانے یا اصلاح کرانے سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے دریافت سے وجہ معلوم ہوئی کہ مشہور حدیث

لاتتخذوا الحلق قبل صلوٰة الجمعة نماز جمعہ سے پہلے حلقے بنا کر نہ بیٹھا کرو۔

میں "الحلق" سے حلقہ بنا کر بیٹھنا مقصود ہے، اسی سے منع کیا گیا ہے، آپ نے اسی "الحلق" کو بمعنی سر گھٹانے کے سمجھ لیا۔ ایک اور محدث کا واقعہ صحیح مسلم کے مقدمہ میں مذکور ہے کہ مشہور حدیث

لاتتخذوا الروح غرضاً کسی جاندار شے کو نشانہ نہ بناؤ

کو آپ نے "لا تتخذ والروح عرضا" پڑھاتے رہے اور مطلب یہ بتلاتے رہے کہ ہوا آنے کی جگہ کو کشادہ نہ بنایا کرو، ان عام لطائف کے سوا صحیح حدیثوں میں عہد صحابہ کے متعدد واقعات ایسے نقل کئے جاتے ہیں کہ ایک صحابی نے قرآن کی آیت روزہ کی سحری کے متعلق

حتی یتبین لکم الخیط تا ایں کہ سفید تاگا سیاہ دھاگے سے
الابیض من الاسود الگ ہو جائے۔

کا مطلب یہ خیال فرمالیا کہ مراد اس سے دو سیاہ اور سفید دھاگے ہیں، اور ان ہی دونوں دھاگوں کو لیکر تکیہ کے نیچے سویا کرتے لیکن اس ذریعہ سے کچھ پتہ نہ چلا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا آپ نے فرمایا

ان وسادتك لعریض تمہارا تکیہ تو بڑا چوڑا ہے۔

یعنی اس سے مراد تو رات کی سیاہی اور صبح کا سپیدہ ہے، تم نے ان دونوں کو اپنے تکیہ کے نیچے دبالیا تو گویا تمہارا تکیہ بڑا چوڑا ہے کہ شب کی تاریکی صبح کی سپیدی بھی اس میں سما جاتی ہے۔

ان ہی صحاح کی کتابوں میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے، ان کو یہ معلوم تھا کہ پانی نہ ملے تو وضو کی جگہ تیمم کرلیا جائے، لیکن غسل کی صورت میں اگر پانی نہ ملے تو آدمی کیا کرے اس کا علم نہ تھا، سفر میں غسل کی حاجت ہوئی تو وضو والے تیمم پر قیاس کر کے خود بیان فرماتے ہیں کہ

فتمرغت فی الصعید — مٹی میں اس طرح میں نے لوٹ لگائی جیسے

کما تمرغ الدابۃ — جانور لوٹ لگاتے ہیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اس اجتہاد (یعنی "تمرغ" یا "تمعک" کا حال بیان فرمایا تو آپ نے سمجھایا کہ

انما یکفیک ان — تمہارے لئے یہ کافی تھا کہ بس ایسا کرتے (یعنی وضو

تصنع ھکذا — والے تیمم کی طرح ہاتھ مار کر اشارہ فرمایا)

مطلب وہی تھا کہ جو وضو والا تیمم ہے، وہی غسل کے لئے بھی کافی ہوسکتا تھا، زمین میں سارے بدن سمیت لوٹنے پوٹنے کی ضرورت نہ تھی۔

اور ان چند واقعات و لطائف کا ذکر تو میں نے ایک تشریحی مثال کی حیثیت سے کیا، ورنہ اپنے حسی معلومات سے جیسے ہر شخص ان نتائج کو نہیں نکال سکتا، جہاں تک حکماء اور ائمہ حکمت و سائنس کی نگاہیں پہنچتی ہیں، جب انسانی فطرت کا یہ کھلا ہوا روزمرہ کا تجربہ ہے تو وحی و نبوت کے معلومات کے نتائج و تفریعات تک ہر شخص کی نگاہ کیسے پہنچ سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ابتدا ہی سے اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو واجب قرار دیتے ہوئے "الامر" حکم دینے کی جن میں صلاحیت ہو ان کی اطاعت کو بھی قرآن کا منصوص مسئلہ اس مشہور آیت میں قرار دے دیا۔ یعنی

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول — فرمانبرداری کرو اللہ کی، اور فرمانبرداری کرو

واولی الامر منکم — رسول کی، اور تم میں جو الامر والے ہوں۔

ظاہر ہے کہ اسلام جو صرف نظم وضبط کا ایک دین ہے، جس میں دو آدمی کو بھی سفر کرتے ہوئے اس کی اجازت نہیں کہ ہر ایک اپنی اپنی مرضی کا پابند ہو بلکہ حکم ہے کہ آپس میں یہ دو آدمی بھی ایک کو آمر (حکم دینے والا) اور دوسرے کو مامور بنا کر سفر کریں۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ جس کے سامنے اپنا عالمگیر مستقبل تھا وہی اسلام مسلمانوں کو ایک ایسی حالت میں چھوڑ دیتا کہ جس کے جو جی میں آئے قرآن و حدیث سے سمجھ لے اور جس قسم کا فیصلہ چاہے کر لے، اللہ اللہ اگر اس کی اجازت دیدی جاتی تو یہ واقعہ نہیں ہے کہ جس طرح ہر شخص کی صورت بلکہ ہر شخص کی آواز دوسرے سے مختلف ہے، اسی طریقہ سے اپنی شخصی خصوصیتوں کی بنا پر ہر مسلمان کا ایک نیا مذہب ہوتا، چالیس کروڑ مسلمانوں کی نماز چالیس کروڑ شکلوں کی ہوتی، اتنے سخت نظم کے بعد بھی جس کا اسلام نے انتظام کیا ہے جب اختلافات کا یہ حال ہے کہ بسا اوقات بعض کور بختوں کے دلوں میں اسلام سے گرانی کی وجہ مسلمانوں کے یہی مذہبی اختلافات بن گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی یہ گرانی قطعاً بے معنی ہے جس کی تفصیل ابھی سنائی جائے گی۔ لیکن آج جو چاہتے ہیں کہ قرآن وحدیث کے سمجھنے میں ہر مسلمان کو خواہ عربی بھی نہ جانتا ہو، اس کی شکل چونکہ انسانوں کی شکل ہے، اسے خواہ فکر نظر، تعقل و تفقہ کی ہوا بھی نہ لگی ہو لیکن چونکہ وہ مسلمان ہے اس لئے اسے آزاد ہونا چاہئے کہ جو چاہے قرآن سے مطلب نکالے اور جس طرح احادیث وسنن کے مقاصد چاہے متعین کرے، ان سے نتائج کا استنباط کرے، دین تو بہر حال دین ہی ہے لیکن دنیا کے معاملات میں بھی اسلام کا نقطہ نظر جب یہ ہو، یعنی امن وخوف کی خبروں میں بھی عام آزادی کے استعمال کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے کے بعد

واذا جاءھم امر من الخوف	اور جب آتی ہے کوئی بات خوف اور امن کی
والامن اذاعوابہ	تو پھیلا دیتے ہیں اس کو۔

قرآن حکم دیتا ہے کہ

لو ردوہ الی الرسول والے	اگر سپرد کر دیں اس کو رسول اور امر والوں کے ساتھ

اولی الامر منہم لعلمہ الذین — تو جان لیں گے (اصل حقیقت) کو وہ لوگ جو اُن
یستنبطونہ منہم — میں بات کی استنباط کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

جس کا مطلب وہی ہے کہ خوف کی خبر ہو، یا امن کی ہر حال میں عام مسلمانوں کو حق نہیں ہے کہ سننے کے ساتھ ہی اسے پھیلا دیں، بلکہ ان کا فرض مقرر کیا جاتا ہے کہ "الرسول" تک پہنچا دیں یا رسول نہ ہو تو پھر "امر" والوں کو خبر کریں، غور کرنے کی بات ہے کہ الخوف میں تو خیر اس کا بھی اندیشہ ہے کہ جنگ وغیرہ کی خبروں کی اشاعت سے نقصان پہنچ جائے۔ لیکن الامن کی خبروں میں بھی قرآن کا جب یہ نقطۂ نظر ہے تو پھر دین جس کا معاملہ دنیا کے خوف و امن دونوں سے اہم ہے، اس میں ہر شخص کو شتر بے مہار بنا کر کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔

الامر والوں کا مطلب | گذشتہ بالا آیت میں اس سوال کا جواب کہ "امر" والوں سے کیا مراد ہے، خود قرآن نے دیدیا ہے یعنی امن وخوف کی خبروں اور جو معلومات اس باب میں حاصل ہوں ان سے صحیح نتائج پیدا کرنے کا جن میں سلیقہ ہو ان ہی کو وہ "الامر" کا حق دیتا ہے یعنی حکم دینے کے وہی مجاز ہیں، اور جب امن وخوف کے معلومات کے متعلق امر والے یہی لوگ ہیں، تو اللہ ورسول کی اطاعت جس کام کے لئے واجب کی گئی ہے یعنی دین میں بھی امر کا حق ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جن میں وحی ونبوت کے معلومات سے صحیح نتائج پیدا کرنے کا سلیقہ ہو اور یہ بھی سچ پوچھئے تو ایک قدرتی بات ہے کہ زندگی کی ہر شاخ میں حکم وامر کا استحقاق ان ہی کو ہوتا ہے جو اس سلسلہ کے معلومات سے صحیح نتائج پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہوں، آخر طب میں انجنیری میں یا ازیں قبیل تمام شعبہائے حیات میں "اکسپرٹ" "فن کار" "فن داں" "ماہر" "حاذق" ہی کو امر اور حکم کا حق کیوں دیا جاتا ہے، وہی فطری وجہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کے چہرے پر آدمی کی کھال مڑھی ہوئی ہے، اس کا زندگی کے ہر شعبہ کے متعلقہ معلومات سے صحیح نتائج کا پیدا کرنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ یہ توقع قطعاً غلط اور غیر فطری ہوگی "عبقات" میں جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے اس موقعہ پر خوب فرمایا ہے۔

ان النفس وان کانت تستعمل
کل قوۃ فی ما انیط بھا، الا
ان استعمالھا علی نحوین
الاول ان یستعملھا
فی ضمن تضاعیف اشتغالھا
بمشاغل متشتتۃ کما ان
العوام یستعملون الفکرۃ فی
ضمن اشتغالھم بالماکل
والمشارب والملابس و
المحسوسات والمخیلات
وقس علیہ سائر القوی فلا
یظفرون الا بقدر ما
یحتاجون الیہ من افاضتھا
والثانی ان یتفرغ لتکمیل
تلک القوۃ ویستقل
النظر الی ما تفیض بھا
وتتجرد بملاحظۃ فنونھا
وشعبھا کتفرغ الفلاسفۃ
بتکمیل العاقلۃ والشعراء
بتکمیل المخیلۃ واھل
الصنائع الدقیقۃ و

ہر قوت کے ساتھ جو کام وابستہ کیا گیا ہے اگرچہ آدمی کا
نفس اس قوت کو اسی کام میں استعمال کرتا ہے
لیکن استعمال کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے
کہ دیگر مختلف کاروبار کے ذیل میں اسے استعمال کرے
مثلاً جو عوام کا حال ہے کہ فکری قوت کو کھانے
پہننے لباس اور محسوسات یا خیالی امور کی دلچسپیوں کے
ذیل میں استعمال کرتے ہیں، اسی پر نفس کی دوسری
قوتوں کے ضمنی استعمال کو قیاس کر کے سمجھو، بہرحال
استعمال کے اس طریقے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام نفس
کی قوت کے نتائج سے اسی حد تک بہرہ ور ہوتے ہیں
جسے قدر ضروری قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان قوتوں
کے استعمال کا ایک اور دوسرا طریقہ بھی ہے اور وہ
یہ ہے کہ جس قوت کا ابھارنا مقصود ہو ہر چیز سے الگ
ہو کر آدمی اسی قوت کی تکمیل میں غرق ہو جائے اور جو
نتیجہ اس سے برآمد ہو اس پر پوری توجہ مبذول رکھے
اور اس کی مختلف شاخوں اور شعبوں میں اپنے
آپ کو فنا کر دے مثلاً فلاسفہ اپنی عقلی قوت کے
ساتھ جو برتاؤ کرتے ہیں، یا خیالی قوت کے ساتھ
شاعروں کو جو تعلق ہوتا ہے یا قوتِ محرکہ عملیہ کی
مشق سے دقیق صناعات والے یا سخت ورزش
یا محنت کرنے والے کام لیتے ہیں، اسی پر دوسری

الٰی الریاضات الشاقۃ	قوتوں کے اس طریقہ استعمال کو قیاس کرو، استعمال کی
بتکمیل المحرکۃ وقس	دوسری شکل میں نفسانی قوت کے آثار و نتائج اور ان کے
علیہ سائر القوی	کاروبار کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے اور بہت زیادہ
فیحینئذ یتسع دائرۃ افا	وسیع، اس میں فراخی پیدا ہوتی ہے اور کیسی فراخی و
عیلھا اشد الاتساع	کشادگی۔
ولیقع فیھا بسط ای	آخر تم ان لوگوں کے علوم پر جن کا تعلق عوام سے ہے
بسط الم ترالی الفرق	غور کرو کہ صرف معمولی شوق و توجہ کی بنیاد پر علم سے
بین علوم العوام من	تعلق رکھتے ہیں لیکن ان ہی کے مقابلہ میں ان دقیقہ
اھل الشوق وبین	سنج نکتہ شناس فلاسفہ کے علوم کا اندازہ کرو کیا دونوں
الفلاسفۃ المدققین[1]	میں کوئی نسبت ہے؟)

اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی واضح حقیقت ہے جو دین اور دنیا دونوں کو حاوی ہے، آج جبکہ ہر بدیہی مسئلہ کو نظری بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے کوئی کیا کہہ سکتا ہے، ورنہ اسلام کو ضبط و نظم کے اس سلسلہ میں اس حد تک اصرار تھا کہ "خطبہ" اور "وعظ" جس میں عموماً قانونی مسائل بیان کئے جاتے ہیں اس کے متعلق بھی عام اعلان کر دیا گیا تھا۔

لا یخطب امیر او مامور	تقریر نہیں کرتا ہے لیکن وہ جو خود صاحب امر ہے یا صاحب
او مختال فخور۔ [2]	امر کا اجازت یافتہ ہے، یا جاہ پرست مغرور آدمی۔

مگر دنیا کے ہر معاملہ میں ماہرین فن کی رائے کا اعتبار کرتے ہوئے محض دین کو آزادی فکر و رائے کی خوبصورت تعبیر سے کیا بازیچۂ اطفال بنا لیا جائیگا۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اس کا اندیشہ ظاہر فرمایا تھا وہی آخر ہو کر رہا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے بخاری میں یہ حدیث مروی ہے گویا آج جو کچھ دکھایا جا رہا ہے اسی کو وقوع سے پیشتر دیکھ لیا گیا تھا، حدیث یہ ہے ۔

---

[1] عبقات ص ۱۳۱ [2] ابن ماجہ۔

عن عمرو بن العاص قال قال	عمرو بن عاص کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا	علیہ وسلم نے علم لوگوں سے یکایک چھین نہیں
ینتزع العلم من الناس انتزاعا	لیا جائیگا بلکہ علم والے اٹھالئے جائیں گے
ولکن یقبض العلماء فیرفع العلم	اس وقت علم بھی اٹھ جائیگا۔ اور لوگوں کے
ویبقی فی الناس رؤس جھال	سردار صرف جاہل لوگ رہ جائیں گے جو
یفتونھم بغیر علم فیضلون	فتوے دیں گے جانے بغیر پھر خود بھی گمراہ
ویضلون۔	ہونگے اور دوسروں کی بھی راہ ماریں گے

"العلماء" سے اس حدیث میں وحی ونبوت کے معلومات کے جاننے والے اور ان سے صحیح نتائج کے استنباط کرنے والے ہی مراد ہیں، بخاری کی اسی روایت کے ایک اور طریقہ میں ان الفاظ کا اضافہ بھی پایا جاتا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اللہ لا ینزع العلم بعد اذ	یقیناً اللہ تم لوگوں کو عطا فرمانے کے بعد علم
اعطاکموہ انتزاعا (الحدیث)	کو چھین نہیں لے گا۔ الحدیث۔

جس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ "العلم" سے مراد یہاں وہی علم ہے جو آخری نبوت کی راہ سے مسلمانوں کو عطا کیا گیا ہے[۱]، اسی علم کے علما اور جاننے والے بتدریج اٹھتے چلے جائیں گے، اور گو زندگی کے

---

[۱] یہ بات کہ جن علوم کا تعلق وحی ونبوت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں ہے، اسلام کا نقطۂ نظر ان کے متعلق کیا ہے، بالکل جداگانہ سوال ہے ایک طرف اگر آنحضرت ہی سے مروی ہے کہ

اللھم انی اعوذ بک من	اے اللہ میں ایسے علم سے جس سے نفع نہ ہو
علم لا ینفع۔	پناہ چاہتا ہوں۔

تو ظاہر ہے کہ جس علم سے انسانیت اور اس کے صالح عناصر برباد ہوتے ہوں ان کا کیا حال ہو سکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ایرانیوں کی جنگی تدبیر خندق کو خود کھود کر اور اپنے صحابیوں سے کھدوا کر یا منجنیق ودبابہ کے استعمال کے لئے صحابیوں کو تیار کرنا اور طائف میں غیر قوموں کے اس طریقہ جنگ کو اختیار کرنا، ایرانی سراویل (شلوار) کو بازار میں دیکھ کر عرب کے ازار (لنگی) پر اسے ترجیح دینا، زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ہر شعبہ میں اس شعبہ کے علما اور ماہرین کی قدرتی ضرورتوں سے آدمی اپنے آپ کو کبھی بے نیاز نہ پائیگا لیکن باوجود اس کے صرف اس علم کے متعلق رائے دینے کی آزادی کا اعلان کردیا جائے گا۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو عطا کیا گیا ہے اور آزادی کے اسی اعلان کے بعد

یفتونھم بغیر علم فیضلون	لوگ فتوے دیں گے جانے بغیر پھر خود گمراہ ہوں گے
ویضلون (بخاری)	اور دوسروں کو گمراہ کریں گے۔

کی پیشین گوئی پوری ہوگی۔

شاید اسی کا تماشا ہے جو آج دیکھا جارہا ہے کاش نہ دیکھا جاتا لیکن جو کہا گیا تھا بہرحال اس کو بھی تو کسی طرح پورا ہی ہونا تھا بہرحال جس خدا نے

ھوالذی ارسل رسولہ	وہی ہے جس نے اپنے رسول کو "الھدی" اور "دین
بالھدی ودین الحق	حق" کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ غالب کردے (اس
لیظھرہ علی الدین کلہ و	الھدی اور دین الحق) کو سارے دین پر، سب پر
کفی باللہ شھیدا۔	اور کافی ہے خدا نگرانی کے لئے۔

کا اعلان کیا تھا یقیناً اپنے پیغمبر کے سامنے اس نے کسی عظیم مستقبل کے نظام کو وقوع سے پہلے کسی نہ کسی شکل میں ضرور ظاہر کردیا تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وقتاً فوقتاً اس کی طرف اشارے فرماتے تھے، خندق کے پتھر کے اکھاڑنے کے وقت بھی وہ دیکھا جاچکا تھا۔ جو بعد کو دیکھا گیا، بخاری اور مسلم جیسی صحیح حدیثوں کی کتابوں میں ہے کہ الارض (کرہ زمین) کے مفاتیح

(حاشیہ بقیہ ص) سریانی زبان و خط کے سیکھنے کا حکم دینا۔ ایسے بیسیوں نمونے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑے ہیں جن سے ان علوم و فنون کے سیکھنے سکھانے کی یقیناً ہمت افزائی ہوتی ہے جن سے زندگی کے کسی شعبہ میں سہولت مہیا ہوتی ہو۔ مگر یہ ایک بالکلیہ جداگانہ چیز ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہوسکتے کہ بلاوجہ پیغمبر کی ان حدیثوں میں بھی جن میں سب جانتے ہیں اور قرائن و حالات، سیاق و سباق کا بھی ان حدیثوں سے یہی اقتضا ہے کہ علم سے مراد علم دین ہے۔ لوگ ان علوم پر ان کو منطبق کرنے کی جرأت کررہے ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(کنجیوں) کے متعلق پیغمبرؐ نے فرمایا کہ وہ مجھے عطا کی گئیں ہیں، ان ہی کتابوں میں ہے کہ زمین کے خزائن بھی آپ پر کھولے گئے، مشرقی قوتوں کے اقتدار اعلیٰ (کسریٰ) اور مغربی قوتوں کے اقتدار اعلیٰ (قیصر) کی ہلاکت کی پیشین گوئی بھی کی جا چکی تھی اور ایسی بیسیوں چیزیں موجود ہیں جن سے بطور قدرِ مشترک کے تواتر و قطعیت کی شکل میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام نے آئندہ جس عظیم عالمگیر سیاسی قوتِ کبریٰ کی شکل کرۂ زمین پر اختیار کی وہ ایک دیکھی بھالی طے شدہ حقیقت تھی، اس کو صحابہ بھی جانتے تھے اور جو اسلام پر دنیا کے آخری دین اور عالمگیر پیغامِ الٰہی کی شکل میں ایمان لا چکے تھے خود ہی سوچنا چاہئے کہ وہ اس کے سوا اور خیال ہی کیا کر سکتے تھے، یہ بات کہ ان کا یہ خیال پورا ہوگا یا نہ ہوگا۔ یا آئندہ جو پورا ہوا، آیا یہ اتفاقی حادثہ تھا جو سنایا گیا تھا وہی دکھایا جا رہا تھا، یہ سارے وسوسے دوسروں میں تو پیدا ہو سکتے تھے یا اب بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کا تو یہی ایمان تھا، یہی ایقان تھا، بہر حال وہ پیش آتا یا نہ آتا لیکن جو یقین کر چکے تھے کہ یہی ہوگا اور یہی ہو کر رہیگا۔ ان کے سامنے اسلام کی پیش آنیوالی وسعت دامانیوں کی ناگزیر آئینی اور قانونی ضرورتوں کا کوئی خیال نہ تھا، کیا یہ بات عقل میں سما سکتی ہے؟

حال تو یہ ہے کہ اسلامی دائرہ کی وسعت حالانکہ ابھی جزیرۂ عرب سے آگے نہیں بڑھی ہے، نبوت ہی کا زمانہ ہے لیکن جس حد تک اسلام کی دینی و اسلامی حدود وسیع ہو چکی تھی، ان ہی علاقوں کے مختلف اطراف و نواحی میں عجیب و غریب نادر شکلوں کے وقوع پذیر ہونے کا تجربہ شروع ہو گیا تھا، ایسی شکلیں کہ آج بھی جب کتابوں میں ہم ان کا ذکر پڑھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔

زبیہ کا واقعہ | مثلاً وہی "الزبیہ" کا حادثہ ہے، زبیہ یمنی زبان میں اس شکاری خندق یا گڑھے کو کہتے ہیں جو عموماً شیر وغیرہ جیسے درندوں کو پھنسانے کے لئے جنگلوں میں کھودے جاتے ہیں، قصہ یہ ہے کہ یمن کے ایک مخلاف (صوبہ) کے والی (گورنر) حضرت علی کرم اللہ وجہہ مقرر ہو کر تشریف لے گئے تھے، آپ کے سامنے ان ہی دنوں میں ایک مقدمہ یہ بھی پیش ہوا کہ زبیہ میں ایک شیر پھنسا

اطراف وجوانب کے تماشا بینوں کا ایک مجمع اس زبیہ کے دیکھنے پر جمع ہوگیا، شیر اسی خندق یا کنویں میں پڑا غرا رہا تھا، تماشہ دیکھنے والوں میں سے کسی پر ہیبت طاری ہوئی۔ بدحواسی میں پاؤں پر قابو نہ رہا اور پھسل کر خندق میں وہ گرنے لگا، بازو میں اس کے ایک آدمی کھڑا تھا بے اختیاری میں اسی کو گرنے والے نے پکڑ کر سہارا لینا چاہا۔ اب یہ بیچارہ بھی اس کے ساتھ چلا، اس نے تیسرے کو تیسرے نے چوتھے کو پکڑ لیا، اور چاروں کے چار ایک ساتھ کنویں میں جا گرے۔ بیچاروں کا جو حشر ایسی صورت میں ہوسکتا تھا ظاہر ہے۔ بھوکے غضب ناک شیر نے سب کی تکا بوٹی کر کے رکھدی۔

مسئلہ کی جو صورت ہے اس میں قاتل و مقتول کا سوال تو پیدا نہیں ہوسکتا تھا کہ سب ہی کا انجام ایک تھا، لیکن کسی مقتول کا خون اسلام میں چونکہ مفت ضائع نہیں ہوسکتا بلکہ جس خاندان کا مقتول رکن ہوتا ہے اس کو حکومت مالی معاوضہ دلاتی ہے، اسی کی تعبیر قانون دیت یا خون بہا یعنی خون کی قیمت سے فقہ میں کی گئی ہے، خون کی یہ قیمت قاتل ہی سے نہیں بلکہ قاتل کے متعلقین سے ان پر چندہ بٹھا کر قسط وار وصول کی جاتی ہے، جن لوگوں پر چندہ بٹھایا جاتا ہے ان ہی کا اصطلاحی نام "العاقلہ" ہے مسئلہ کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں پڑھنا چاہیئے اس وقت میری غرض صرف ایک نادر الوقوع حادثہ کو بطور مثال پیش کرنا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس مقدمہ پیش ہوا اور سوال اٹھا کہ ان چاروں میں سے کسے قاتل اور کسے مقتول قرار دیا جائے اور خون کے معاوضہ کی نوعیت کیا قائم کی جائے، یہ معاوضہ کن لوگوں سے وصول کیا جائے۔

سوال یقیناً پیچیدہ تھا، لیکن اسلام نے ان حوادث پر حکم لگانے کا جو ایک دروازہ کھول دیا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی راہ سے فیصلہ فرمایا۔ فیصلہ کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک جب پہنچی تو ارشاد ہوا۔

ھو کما قال — فیصلہ وہی ہے جو علیؓ نے کہا۔

اور یہ صرف ایک ہی واقعہ نہیں ہے، ان چکرا دینے والے قانونی یا شرعی مسائل کا ایک ذخیرہ کتابوں میں محفوظ ہے جو عہدِ نبوت اور عہد صحابہ میں پیش آئے۔

اسی ضرورت کا اسلامی حل اور اولوالامر کے پیدا کرنے کا نظام

پس یہی ناگزیر ضرورت یعنی وحی و نبوت کے معلومات کے استعمال صحیح اور ان سے آئندہ پیش آنے والے واقعات و حوادث کے متعلق جدید نتائج و احکام کو صحیح اصول پر مستنبط کرنا اور اسی کے مطابق امر و حکم دینے کی واقعی صلاحیت و قابلیت ماہرانہ لیاقت و استعداد پیدا کرنے کے لئے قرآن میں حق تعالیٰ نے۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ	پھر کیوں نہ چل پڑا ہر فرقے سے ایک گروہ
لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم	"الدین" میں سمجھ پیدا کرنے کیلئے تاکہ چونکائیں
اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون	اپنی قوم کو وہ لوگ جب پلٹ کر آئیں ان کے
(التوبہ رکوع ۱۳۶)	پاس شائد کہ وہ (ناکردنیوں) سے بچیں۔

کی آیت نازل فرما کر "تفقہ فی الدین" پیدا کر کے امر و حکم کے صحیح استحقاق حاصل کرنے والوں کے لئے اسلام میں ایک مستقل باب کا افتتاح فرما دیا۔ حتیٰ کہ اسی نص محکم سے جو دراصل قیامت تک پیش آنے والی دینی و قانونی ضرورتوں کے حل کی اساسی بنیاد ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی اسی آیت کی روشنی میں اپنی کتاب الاحکام میں اسی آیت کو پیش کر کے لکھتے ہیں۔

فرض علی کل	مسلمانوں کی جماعتیں خواہ وہ کسی گاؤں میں یا کسی بازار
جماعۃ مجتمعۃ فی قریۃ او	یا کسی بدوی منزل یا قلعہ میں جہاں کہیں بھی اکٹھی
دسکرۃ وھی المجشرۃ عندنا	ہو کر آباد ہو جائیں ان پر فرض ہے کہ ان میں کچھ لوگ
او حلۃ اعراب او حصن	مذہب اور دیانت کے تمام احکام کے طلب و تلاش و
ان ینتدب منھم لطلب	تحصیل کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ یعنی اول سے آخر تک
جمیع احکام الدیانۃ اولھا	مذہب کے تمام مسائل کو سیکھیں، ان کو چاہیے کہ پورے
عن آخرھا وتعلم القرآن کلہ	قرآن کی تعلیم حاصل کریں اور احکام کی حدیثوں میں

والکتاب وکل ما صح عن	جو صحیح ثابت ہو چکی ہیں ان کی کسی کتاب کو پڑھیں،
النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن	اول سے آخر تک، چاہیئے کہ ان حدیثوں کے ہر ہر
احادیث الاحکام اولھا عن	لفظ کو ضبط کریں نیز مسلمانوں کا جن مسائل پر اجماع
آخرھا وضبطھا بنصوص الفاظھا	واتفاق ہے ان کا بھی علم حاصل کریں اور جن میں
وضبط کل ما اجمع علیہ المسلمون	مختلف ہیں ان کا بھی۔
وما اختلفوا فیہ ... ففرض	بہرحال ان پر واجب ہے سفر کرنا ان علاقوں کی
علیھم الرحیل الی حیث	طرف جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہرین مل سکتے
یجدون العلماء المحتوین علی	ہیں خواہ یہ علاقے ان کے ملک سے دور ہی کیوں
صنوف العلم وان بعدت	نہ ہوں حتی کہ چین ہی میں علماء کا یہ طبقہ کیوں نہ
دیارھم ولو انھم بالصین[1]۔	رہتا ہو۔

اسی آیت کی ذیل میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جس طرح ہر اجتماعی طبقہ سے کسی نہ کسی کو اس کام کے لئے مستعد ہو جانا فرض ہے۔ یوں ہی

فرض علی جمیع المسلمین	تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کے ہر گاؤں، ہر شہر
ان یکون فی کل قریۃ	یا قلعہ میں ایسے آدمی ہوں جنھیں پورا قرآن یاد ہو اور
او مدینۃ او حصن من یحفظ	لوگوں کو وہ قرآن سکھاتا ہو اور پڑھاتا ہو (یعنی مسلمانوں
القرآن کلہ ویعلمہ الناس	کو چاہیئے کہ اپنی اپنی آبادیوں میں ایسے پڑھانے والوں
ویقرئہ ایاھم۔	کو مہیا کریں)۔

بہرحال وہی ضرورت یعنی وحی و نبوت کے ان آخری علوم کے مطابق الامر اور حکم دینے کا دروازہ قیامت تک ہر اس شخص کے لئے کھلا رہے جو اپنے لئے اسلامی نظام کے تحت زندگی گذارنے کا فیصلہ کر چکا ہو، قرآن میں یہ واجب اور فرض قرار دیا گیا کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت سے ایک گروہ

---

[1] الاحکام ج ۵ ص ۱۲۳۔

وحی و نبوت کے ان معلومات کی سمجھ اور ان میں تفقہ پیدا کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس خطاب کے پہلے مخاطب اور اس فرض کے پہلے مکلف وہی حضرات ہو سکتے تھے جنھیں ہم مسلمانوں کا پہلا قرن یا پہلا طبقہ سمجھتے ہیں، میری مراد صحابہ کرام اور عہدِ نبوت کے مسلمانوں سے ہے اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے اپنے خاص رجحانات اور فطری مناسبتوں کے ساتھ صحابہ میں کچھ لوگ اس فریضہ قرآنی کے انجام دہی کے لئے آمادہ ہو گئے۔

فقہ اسلامی کے پہلے معلم (صلی اللہ علیہ وسلم)

ظاہر ہے کہ دین میں تفقہ پیدا کرانے یا وحی و نبوت کے معلومات سے متعلق سوجھ بوجھ پیدا کرانے کا پہلا کام جس ہستی سے متعلق ہو سکتا تھا وہ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی، قرآن پاک میں

الکتاب والحکمۃ سکھاتا ہے (ان مسلمانوں کو) الکتب اور الحکمت

ہی آپ کا فریضہ قرار دیا گیا تھا، محض اس لئے کہ سیکھنے والوں میں سے ایک صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب آئے تو کسی خاص وجہ سے جتنی توجہ کا ایک طالب العلم مستحق ہو سکتا ہے۔ چونکہ بارگاہِ نبوت سے اتنی توجہ مبذول نہ ہوئی، سب جانتے ہیں کہ صرف اسی لئے قرآن میں پیغمبر کو خطاب کر کے۔

عبس وتولّی ان جاءہ الاعمیٰ — منہ کڑھالیا اور اعراض کیا اندھے کے آنے پر اور

ومایدریک لعلہ یزکی او یذکر — کس نے بتایا کہ وہ پاکیزگی حاصل کرےگا یا نصیحت

فتنفعہ الذکری۔ — سنے گا پھر نصیحت اسے فائدہ نہ پہنچائیگی۔

اسی کے ساتھ

واما من جاءک یسعیٰ وھو یخشیٰ — مگر جو دوڑا ہوا آیا حالانکہ وہ ڈرتا ہے تو تم نے اس

فانت عنہ تلھّی — سے بے پروائی برتی۔

کی آیتیں نازل ہوئیں اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے متعلق یہ اعلان کرنا پڑا کہ

انما بعثت معلماً (صحاح) میں معلم بنا کر بھیجا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچنے کے ساتھ ہی مسجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اسی میں "صُفّہ" کے نام سے ایک باضابطہ تعلیم گاہ کا افتتاح فرمادیا، تاکہ علاوہ اس عام دعوت و تبلیغ کے جو ہر شخص کے لئے عام تھی، دین کے مختلف شعبوں میں تفقہ اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے کا ان لوگوں کو موقع دیا جائے جو ان شعبوں میں سے کسی شعبہ میں یا چند شعبوں میں امر اور حکم دینے کا جائز استحقاق حاصل کرسکیں، صفہ جو مسجد نبوی کا ایک مشہور ادارہ تھا، اگرچہ اسی کا ایک استعمال یہ بھی تھا کہ نو مسلموں میں سے جن لوگوں کے رہنے سہنے کا نظم نہ تھا ان کی وہ سکونت گاہ تھی، لیکن اس سے زیادہ جو کام اس ادارہ سے عہد نبوت میں لیا جاتا تھا وہ زیادہ تر دین کے مختلف شعبوں کی تعلیم و تعلم ہی کا کام تھا، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوت کی اس تعلیم گاہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد بیک وقت کبھی کبھی اسی بچاسی تک پہنچ جاتی تھی۔ بخاری میں ہے کہ انصار میں سے صرف ستر آدمیوں نے اس میں داخلہ حاصل کیا تھا۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔

سبعین من الانصار	ستر آدمی انصار میں تھے جنھیں ہم ان کے زمانے
کنا نسمیهم القراء فی	میں "القرآ" کے نام سے موسوم کرتے تھے یعنی
زمانهم۔	پڑھنے والے لوگ

اسی روایت کا دوسرا جزء جس سے ان لوگوں کے بسر اوقات کے ذرائع کا بھی پتہ چلتا ہے، یہ ہے

کانوا یحتطبون بالنهار	یہ لوگ دن کو لکڑیاں چنتے تھے جب بیچ کر پھر اس
یشترون به الطعام لاهل	سے کھانا خریدتے تھے، صفہ والوں کے لئے اور
الصفة ویتدارسون القرآن	رات کو باہم مل کر قرآن پڑھا کرتے تھے اور
باللیل ویتعلمون۔ [1]	علم سیکھتے تھے۔

دوسری روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف شکلوں میں صفہ میں شریک ہونے والوں کی امداد ہوتی تھی۔

---

[1] فتح الباری ج ۷، ص ۲۹۷۔

بہرحال صفہ کی تعلیم گاہ میں شریک ہونے والوں کا ایک تو عام گروہ تھا جن کا مقصد معمولی نوشت وخواند، قرآن پڑھنا، نماز سیکھنا، عام معمولی اسلامی مسائل سے واقف ہونا تھا۔

لیکن اسی کے ساتھ جیساکہ آئندہ تفصیل سے بیان کیا جائیگا کہ مختلف رجحانات اور فطری مناسبتوں کا اندازہ کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصصین کی بھی ایک جماعت صحابہ میں تیار کی تھی۔

ابھی تو مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ "تفقہ فی الدین" کے قرآنی مطالبہ کی تکمیل کے لئے دین کے مختلف شعبوں کے ساتھ خصوصیت پیدا کرنے کے سلسلے میں ایک اچھی خاصی تعلیمی ہلچل عہدِ نبوت ہی میں پیدا ہوچکی تھی۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں جیساکہ ان کا خاص طریقہ ہے "کتاب العلم" کا باب قائم کرکے عہدِ نبوت کے مختلف تعلیمی واقعات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کرکے اس زمانہ کے نظامِ تعلیم کا جو خاکہ تیار کیا ہے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج جن چیزوں کو موجودہ زمانے کی تعلیمی ترقیوں کی خصوصیت قرار دیا جاتا ہے۔ بمشکل کوئی چیز ایسی باقی رہ گئی ہے جسے امام نے صحیح روایتوں کی روشنی میں یہ نہ دکھایا ہو کہ سب کچھ اسی زمانہ میں ہوچکا تھا۔ تفصیل کے لئے تو خود بخاری کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

بخاری کے کتاب العلم کا خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم کی اہمیت وضرورت، مردوں کی تعلیم، عورتوں کی تعلیم غلاموں کی تعلیم، آغازِ تعلیم کی عمر، طریقۂ تعلیم، حلقۂ درس، حلقۂ درس کے قوانین وآداب، صف بندی، نشست کا طریقہ، تدریس کے وقت مدرس کی آواز کی بلندی وپستی تفہیم کا طریقہ، ہاتھ اور آنکھوں سے کسی بات کو سمجھانا؛ تدریس کے مختلف طریقے، املا یا لیکچر یعنی استاد کا بولنا اور طلبہ کا سننا، عرض یعنی شاگرد کا پڑھنا، استاد کا سننا، تعلیم میں تدریج کا طریقہ یعنی آسان مسائل سے بہ تدریج مشکل مسائل تک طلبہ کو پہنچانا، ہر جماعت میں اسی جماعت کی استعداد وصلاحیت کے مطابق استاد کے اسباق کی نوعیت، استاد کا طلبہ پر غصہ ہونا۔ الغرض اس قسم کے مختلف تعلیمی مسائل کے ساتھ ساتھ امتحان، تعطیل، تعطیل کی ضرورت وغیرہ وغیرہ

تقریباً ساٹھ سے اوپر عنوانوں کے متعلق امام نے صحیح حدیثیں پیش کی ہیں اور ان امور کے متعلق حدیثوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے سب کو بیان فرمایا ہے۔

غریب عرب کی اسلام سے پہلے جو حالت تھی قرآن میں اس کی تعبیر جاہلیت کے لفظ سے کی گئی ہے اور جاہلیت کا یہ لفظ قرآنی اصطلاح کو چھوڑ کر عموماً اس زمانہ میں نوشت وخواند کی ناواقفیت کے ہم معنی ہوگیا ہے ممکن ہے کہ جاہلیت کے اس مغالطہ سے جن کے دماغ متاثر ہیں ان کے لئے ابتدا ء اسلام میں "تعلیم اور اصول تعلیم" کے متعلق اتنے تفصیلی مباحث باعث تعجب ہوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ خود قرآن میں بکثرت آیتیں علم کی عظمت واہمیت کے متعلق موجود ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم وتعلم کے فضائل کے متعلق جس قسم کی حوصلہ افزا حدیثیں صحاح میں مروی ہیں جن کی ان پر نظر ہے ان کے لئے ان بیانات میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جس دین کی ابتدا ہی اقراء یعنی خواندگی کے مطالبہ سے ہوئی ہے اور "علم بالقلم" کے الفاظ جس کی وحی کے ابتدائی فقروں میں شریک ہوں سب سے پہلی بات جو خدا نے پہلی دفعہ مسلمانوں سے کی اسی میں

علم الانسان مالم یعلم — سکھایا آدمی کو وہ چیز جسے وہ نہیں جانتا

کی حقیقت پر متنبہ کرتے ہوئے بتا دیا گیا کہ "انسان" کو تمام دوسری ہستیوں کے مقابلہ میں جو خاص خصوصیت حاصل ہے وہ یہی ہے کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو کچھ نہیں جانتا۔ لیکن مالم یعلم (جسے وہ نہیں جانتا) ان کے جاننے اور سیکھنے کی اس میں صلاحیت ہے اسی لئے آدم زاد جاہل پیدا ہوتا ہے اور بسا اوقات علامہ، فلاسفر، حکیم، اور خدا جانے کیا کیا ہو کر مرتا ہے، اسی کے مقابلہ میں دوسری جاندار ہستیاں (حیوانات) ہیں کہ بقول سعدی

"مرغک از بیضہ بروں آمد وروزی طلبد"

انڈا کھٹکنے کے ساتھ ہی تلاش معاش کی تدبیروں میں وہ مشغول ہوجاتے ہیں، پیدا ہونے کے وقت بھی ان کا یہی حال ہوتا ہے اور جس دن مرتے ہیں تو اس علم میں سرمو اضافہ نہیں ہوتا۔

بہر حال "علم الانسان مالم یعلم" جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی وحی کا آخری فقرہ ہے اس میں آدمی کو تعلیمی حقیقت قرار دینے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بنی آدم کے اس آخری دین میں سب سے زیادہ اہمیت تعلیم ہی کو دی جائے گی اس لئے اس کی بنیاد میں سب سے پہلا پتھر "اقرأ" ہی کا جمایا گیا ہے، یعنی اس کی بنیاد نوشت و خواند پر قائم ہے اور یہ واقعہ ہے کہ رہتی دنیا تک سارے بنی آدم کے لئے عالمگیر ہمہ جہتی آئینِ حیات ہونے کا جو دعویٰ اسلام نے کیا ہے، یقیناً یہ دعویٰ اسی وقت عملی شکل اختیار کرسکتا تھا کہ اس دین کی بنیاد تعلیم و تعلم تفقہ و اجتہاد پر رکھی جائے ورنہ آج تیرہ سو سال تک اسلام دنیا کے ہر خطہ کے باشندوں کے ہر شعبہ حیات پر جو بآسانی منطبق ہوتا رہا یہ کامیابی بغیر اس تدبیر کے کیا حاصل ہو سکتی تھی جو قراۃ، تعلیم، تعلم، تفقہ فی الدین کے ذریعہ سے اسے حاصل ہوئی۔

ان قولی و فعلی تصریحات کے سوا جن کا ذکر تعلیم و تعلم، تفقہ و قراۃ کے متعلق گذر چکا، یوں بھی ایک مورخ ہونے کی حیثیت سے بھی اگر مکہ نہیں تو مدینہ منورہ اور اس کے اطراف و نواحی کے یہودی ماحول سے جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ خاص مدینہ منورہ میں یہودیوں کی ایک مستقل درسگاہ تھی جسے بیت المدارس کہتے تھے۔ جہاں باضابطہ پڑھنے پڑھانے کا رواج پہلے سے جاری تھا، سرزمینِ عرب ہی کے علاقہ یمن میں عیسائیوں کا بھی ایک مستقل تعلیمی نظام موجود تھا، ابنِ ہشام وغیرہ نے نجران کے اسقف اعظم کے جو حالات نقل کئے ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ عیسائی ممالک کا ممتاز ترین عالم اس زمانے میں عرب ہی میں رہتا تھا[1]۔ پھر قدیم دنیا کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز اسکندریہ بھی عرب سے دور

---

[1] ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ اس کا نام ابوحارثہ تھا و کان اسقفھم وحبرھم وامامھم وصاحب مدارسھم (یعنی نجران میں عیسائیوں کا وہ اسقف اور حبر و امام) نیز مدارس (مدرسہ) کا ناظم تھا اسی کتاب میں ہے کہ ابوحارثہ قد شرف فیھم و درس من کتبھم حتی حسن علمہ (باقی حاشیہ ص پر ملاحظہ ہو)

نہ تھا، نہ عرب اس مشہور تعلیمی ملک سے ناواقف تھے، نیز انطاکیہ حران فلسطین جہاں یہودیوں اور نصرانیوں کے تعلیمی ادارے زمانے سے قائم تھے۔ یہ سارے علاقے عرب کے آس پاس ہی میں تھے۔

بہر حال عہد نبوت ہی میں "تفقہ فی الدین" میں خصوصیت پیدا کرنے کے لئے کسی تعلیمی نظام کا قائم ہو جانا میرے نزدیک نہ اس میں عقلاً استبعاد ہے اور نقلاً تو عرض ہی کر چکا کہ قرآن ہی کا حکم تھا کہ ایک گروہ اس کام کے لئے مسلمانوں میں قائم کیا جائے اور اسی طبقہ کے ذمہ یہ فریضہ سپرد کیا گیا کہ مسلمانوں کا علم اور ان کا عمل کس حد تک "اسلامی دستور" پر منطبق ہے، اس کی نگرانی کریں، اور آئے دن نئے حوادث و واقعات کے سلسلے میں جو ضرورتیں پیش آتی رہیں، وحی و نبوت کے معلومات کو پیش نظر رکھکر مسلمانوں کو ان ضرورتوں کے متعلق امر و حکم دیا کریں "تفقہ فی الدین" کے مطالبہ کی گذشتہ بالا قرآنی آیت کے سوا دوسری جگہ قرآن ہی میں

ولتکن منکم امة یدعون الی	چاہئے کہ تم میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہو جو خیر کی
الخیر یامرون بالمعروف و	طرف بلائے، اچھی باتوں کا امر و حکم دے اور بری
ینھون عن المنکر۔	باتوں سے روکے۔

کی آیت میں بھی اسی "تعلیمی طبقہ" کے پیدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کے سوا بھی مختلف قرآنی آیتوں میں صراحۃً و کنایۃً اس مطالبہ کو مختلف طریقوں سے دہرایا گیا ہے جو عام طور پر مشہور ہیں، مثلاً علم ہی کی وجہ سے آدم کو ملائکہ پر فضیلت بخشی گئی، نیز متعدد مقامات میں پوچھا گیا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ) (اس نے عیسائیوں میں بڑی عزت حاصل کی ان کی کتابیں پڑھیں یہاں تک کہ اس کا علم پختہ ہو گیا) آگے ہے کانت ملوک الروم من اہل النصرانیۃ قد شرفوہ و مولوہ واخدموہ و بنوا لہ الکنائس و بسطوا علیہ الکرامات لما یبلغہم عنہ من علمہ واجتہادہ فی دینہم (یعنی ابوحارثہ کے علم و اجتہادی قوت کا چرچا جب روم (یورپ) کے عیسائی بادشاہوں تک پہنچا تو انھوں نے اس کی بڑی عزت کی اور اسے مالدار بنا دیا اس کی بڑی خدمتیں کیں اس کے لئے گرجے بنوائے اور مختلف طریقوں سے اکرام انعام کی بارش اس پر برساتے رہے۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۴۵ مصر)

کہ عالم اور جو عالم نہ ہو کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔

بہر حال ایک طرف اسلام میں "تفقہ فی الدین" کے لئے مخصصین کے ایک خاص طبقہ کا قائم کرنا اور دوسری طرف جہل کی فطری ضرورت کی تکمیل کے لئے قرآن ہی کا۔

فاسئلوا اهل الذکر	پوچھ لیا کرو، یاد رکھنے والوں سے، اگر تم
ان کنتم لا تعلمون۔	خود نہیں جانتے۔
واتبع سبیل من	اور جو میری طرف جھکے ہوئے ہیں ان کی راہ
اناب الی۔	کی پیروی کرو۔

کے قانون کو نافذ کرنا، ان سب کا لازمی نتیجہ وہی ہونا چاہئے تھا جس کی تفصیل ہمارے مورخین نے بیان کی ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ دوسری اور تیسری نسل ہی میں نہیں بلکہ عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ ہی میں مسلمانوں کے طبقہ اولی یعنی صحابہ کرام میں "اہلِ علم وفتوی" کا ایک مخصوص طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنی اس خصوصی حیثیت وخدمت کے لحاظ سے عام صحابہ میں بالکل ممتاز تھا۔ اور اسلامی تاریخ کا یہی پہلا طبقہ ہے جس میں تدوینِ فقہ کے کام کا آغاز ہوا، لیکن اس طبقہ کے خدمات کے تذکرہ سے پہلے عہدِ نبوت کی ایک اور اہم خصوصیت کا اظہار ناگزیر ہے۔

عہد نبوت میں استفتار یا سوال کے متعلق تحدید

بات یہ ہے کہ نبوت کا دعوی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عربوں میں پیش ہوا، ظاہر ہے کہ اس کا کھلا ہوا واضح مطلب یہی تھا کہ علم وعمل کا جو نظام ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس کا تعلق کسی انسان کی محدود فکری قوت اور ناقص پرواز ورسائی سے نہیں، بلکہ عالم الغیب والشہادہ کے علم محیط کلی سے ہے، ایسے محیط اور کلی علم سے جس سے کھلی، ڈھکی، ظاہر و باطن، ماضی وحال، مستقبل کی کسی چیز کا کوئی پہلو پوشیدہ نہیں ہے۔

پھر جیسا کہ معلوم ہے کہ ابتداءً عربوں کو اس دعوی پر اچنبھا بھی ہوا، وہ بدگمان بھی ہوئے

بدکے بھی، بھڑکے بھی، الغرض عام انسانی فطرت ایسے موقعہ پر جو کچھ کرتی ہے سب ہی کا ظہور ان سے ہوا۔ بلکہ باوجود جاہل کہلانے کے عربوں میں آزادی اور حریت کا جو خاص نسلی جرثومہ تھا جس کی وجہ سے حجاز میں کوئی شخصی حکومت قائم نہ ہو سکی، متعدد بار قیصر وغیرہ کی پشت پناہی میں بعضوں نے حجاز کی بادشاہی کا ارادہ بھی کیا لیکن ان کو ناکام ہونا پڑا[۱]

باوجودیکہ تین سو، ساڑھے تین سو سال سے حجاز کے عرب ہمسایہ ممالک کے میل جول کے زیر اثر "اصنامی اوہام" کے شکار ہو گئے تھے، لیکن عرب کی حقیقت پسند فطرت کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے، کہ قحط کے زمانے میں کھجوروں سے بنے ہوئے دیوتا کے چٹ کر جانے سے بھی عرب کا بت پرست نہ ہچکچایا۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ "نبوت" کے تجربہ میں عربوں کو دس بارہ سال کی جو دیر لگی یہ بھی ان کی اسی بے باک فطرت اور بے لاگ قوت فیصلہ کا اگر اثر ہو تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے۔

بہرحال ان تمام بدگمانیوں اور ابا و استنکاف کے بعد جب ان سے مشاہداتی تجربات نے ان پر واضح کر دیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے صرف حقیقت کا اظہار ہے تو اس قسم کے بے لاگ فیصلہ والوں کا جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ یا تو نہیں مانیں گے لیکن جب حقیقت بالآخر کسی واقعہ کے تسلیم کرنے پر انھیں مضطر کر دیتی ہے تو پھر ان کا ماننا ان کمزور ارادے والوں کا ماننا نہیں ہوتا جن کی ساری عمر کٹ جاتی ہے لیکن کسی قطعی فیصلہ کے لنگر کے ساتھ ان کی زندگی کا جہاز مربوط نہیں ہوتا۔ یہی حال عرب کا ہوا کہ جب مانا تو پھر اس طرح مانا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احد کے میدان میں پوچھنے والے پوچھتے ہیں۔

---

[۱] عہد نبوت سے چند سال پہلے عثمان بن حویرث نامی مکہ کا رہنے والا ایک شخص قسطنطنیہ جا کر عیسائی ہو گیا تھا۔ سہیلی نے اس کے متعلق نقل کیا ہے ان قیصر کان قد توج عثمان وولاہ امر مکۃ (قیصر نے عثمان کو تاج شاہی سے سرفراز کر کے مکہ کی حکومت اسے سپرد کی) آگے لکھا ہے فلما جاءھم بذلک انفوا من ان یدینوا الملک (جب عثمان اس قیصری فرمان کو لیکر مکہ والوں کے پاس آیا تو انھوں نے کسی بادشاہ کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کیا) دیکھو روض الانف ج ۱ ص ۱۴۶ مطبوعہ مصر۔

ارئیت ان قتلت فاین انا آپ خیال فرماتے ہیں اگر میں مارا گیا تو میں کہاں رہونگا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف دو لفظوں

فی الجنۃ جنت میں

کے ساتھ جواب دیتے ہیں، جنھوں نے پوچھا تھا ان کے ہاتھ میں چند کھجوریں تھیں، انھیں پھینکتے ہیں اور جیسا کہ بخاری میں ہے۔

ثم قاتل حتی قتل پھر وہ لڑے اور شہید ہو گئے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ کھجوروں کو پھینکتے ہوئے یہ بھی کہتے جاتے تھے۔

"اگر ان کھجوروں کے کھانے تک میں جیتا رہا تو یہ بڑی دراز زندگی ہو گی"

یعنی جنت پہنچنے میں دیر لگے گی۔ اور ایک یہی واقعہ کیا، اعتماد و یقین کا جو ثبوت نسلِ انسانی کے اس طبقہ نے پیش کیا ہے جس کا نام

"اصحاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

ہے، انسانیت کی تاریخ قطعاً اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، والقصہ بطولہا۔

بہر حال اعتماد و یقین کی جس قوت کے ساتھ صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو خدا کے علم محیط سے وابستہ تسلیم کیا تھا جس کے دوسرے معنی یہ تھے کہ براہِ راست خدا سے سوال و جواب اور مکالمہ کا نادر موقعہ یقین کرتے تھے انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے میسر آگیا ہے۔

سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کی سراپا جستجو فطرت، علم کے ایسے لامحدود سرچشمے پر اپنے آپ کو جب کھڑی پائے گی تو اس کا کیا حال ہو سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک اس خیال میں محو تھا کہ جو کچھ ہم پوچھ سکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسے پوچھ لینا چاہیے۔

(باقی آئندہ)